

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

قادیانیت

نے
عالم اسلام کو کیا دیا

صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش

ہم کو ایک علمی اور حقیقت پسند انسان کے نقطہ نظر سے تحریک قادیانیت کا تاریخی جائزہ لینا چاہیے۔ اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید میں کونسا کارنامہ انجام دیا اور عالم اسلام کی جدید نسل کو کیا عطا کیا۔ نصف صدی کی اس پر آشوب اور ہنگامہ خیز مدت کا حاصل کیا ہے؟ تحریک کے بانی نے اسلامی مسائل اور متنازع فیہ امور پر جو ایک وسیع و پھیل کتب خانہ یادگار چھوڑا ہے۔ اور جو تقریباً ۷۰ برس سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ اور ماحصل کیا ہے؟ قادیانیت عصر جدید کے لئے کیا پیغام رکھتی ہے؟

ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لئے پہلے ہم کو اس عالم اسلامی پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ جس میں اس تحریک کا ظہور ہوا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس کی کیا حالت تھی اور اس کے کیا حقیقی مسائل و مشکلات تھے۔

اس عہد کا سب سے بڑا واقعہ جس کو کوئی مؤرخ اور کوئی مصلح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ تھا کہ اسی زمانہ میں یورپ نے عالم اسلام پر بالعموم اور ہندوستان پر بالخصوص یورش کی تھی۔ اس کے جلد میں جو نظام تعلیم تھا۔ وہ غدا پرستی اور خدا شناسی کی روح سے عاری تھا۔ بوہذیب تھی وہ اتحاد اور نفس پرستی سے محروم تھی۔ عالم اسلام، ایمان، علم اور مادی طاقت میں کمزور ہو جانے کی وجہ سے اس نو فیز و مسلح مغربی

۱۔ مرزا صاحب کی تصانیف کی تعداد ۸۰ سے کم نہیں ہے ان میں اکثر نہایت ضخیم اور کئی کئی جلدوں کی کتابیں ہیں۔

طاقت کا آسانی سے شکا ہو گیا۔ اس وقت مذہب میں (جس کی نمائندگی کے لئے صرف اسلام ہی میدان میں تھا) اور یورپ کی علمی اذہ اور مادہ پرست تہذیب میں تصادم ہوا۔ اس تصادم نے ایسے نئے سیاسی، تمدنی، علمی اور اجتماعی مسائل پیدا کر دیئے جن کو صرف طاقتور ایمان، راسخ و غیر متزلزل عقیدہ، یقین، وسیع اور عمیق علم، غیر مشکوک اعتماد و استقامت ہی سے حل کیا جاسکتا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک طاقتور علمی و روحانی شخصیت کی ضرورت تھی۔ جو عالم اسلام میں روح بہاد اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر دے جو اپنی ایمانی قوت اور دماغی صلاحیت سے دین میں ادنیٰ تعزیت و ترمیم قبول کئے بغیر اسلام کے ابدی پیغام اور عصر حاضر کی بے چین روح کے درمیان مصالحت و رفاقت پیدا کر سکے اور مشرخی و پرچش مغرب سے آنکھیں ملا سکے۔

دوسری طرف عالم اسلام مختلف دینی و اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار تھا۔ اس کے چہرہ کا سب سے بڑا داغ وہ شرک جلی تھا جو اس کے گوشہ گوشہ میں پایا جاتا تھا۔ قبریں اور تعزیے بے محابا ترج رہے تھے۔ غیر اللہ کے نام کی صاف صاف دہائی دی جاتی تھی۔ بدعات کا گھر گھر چرچا تھا۔ خرافات اور توہمات کا دور دورہ تھا۔ یہ صورت حال ایک ایسے دینی مصلح اور داعی کا تقاضا کر رہی تھی جو اسلامی معاشرہ کے اندر جاہلیت کے اثرات کا مقابلہ اور مسلمانوں کے گھروں میں اس کا تعاقب کرے جو پوری وضاحت اور جرأت کے ساتھ توحید و سنت کی دعوت دے اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اَللّٰہُ الْمَدِّیْنُ الْمُخَالِصُ کا نعرہ بلند کرے۔

اسی کے ساتھ بیرونی حکومت اور مادہ پرست تہذیب کے اثر سے مسلمانوں میں ایک خطرناک اجتماعی انتشار اور افسوس ناک اخلاقی زوال رونما تھا۔ اخلاقی انحطاط فسق و فجور کی حد تک لغزش و اسراف نفس پرستی کی حد تک حکومت و اہل حکومت سے مرغوبیت ذہنی غلامی اور ذلت کی حد تک مغربی تہذیب کی نقائی اور حکمران قوم (انگریز) کی تقلید کفر کی حد تک پہنچ رہی تھی۔ اس وقت ایک ایسے مصلح کی ضرورت تھی جو اس اخلاقی و ذہنی انحطاط کی بڑھتی ہوئی زد کو روکے اور اس خطرناک رجحان کا مقابلہ کرے جو حکومت و غلامی کے اس دور میں پیدا ہو گیا تھا۔

تعلیمی و علمی حیثیت سے حالت یہ تھی کہ غوام اور محنت کش طبقہ دین کے مبادئی اولیات سے نادانق اور دین کے فرائض سے بھی غافل تھا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ شریعت اسلامی، تاریخ اسلام اور اپنے ماضی سے بے خبر اور اسلام کے مستقبل سے مایوس تھا۔ اسلامی علوم رو بہ زوال اور پرانے تعلیمی مرکز عالم نزع میں تھے۔ اس وقت ایک طاقتور تعلیمی تحریک اور دعوت کی ضرورت تھی۔ نئے مکاتب و مدارس

کے قیام، نئی اور مؤثر اسلامی تصنیفات اور نئے سلسلہ نشر و اشاعت کی ضرورت تھی جو امت کے مختلف طبقوں میں مذہبی واقفیت، دینی شعور اور ذہنی اطمینان پیدا کرے۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ انبیاء السلام کے طریقہ دعوت کے مطابق اس امت کو ایمان اور عمل صالح اور اس صحیح اسلامی زندگی اور سیرت کی دعوت دی جائے جس پر اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت، دشمنوں پر غلبہ اور دین و دنیا میں فلاح و سعادت اور سر بلندی کا وعدہ فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کی ضرورت دین بیدار نہیں ایمان جدید ہے۔ کسی دور میں بھی اس کو نئے دین اور نئے پیغمبر کی ضرورت نہیں تھی۔ دین کے ان ابدی حقائق و عقاید اور تعلیمات پر نئے ایمان اور نئے جوش کی ضرورت تھی جس سے زمانہ کے نئے فتنوں اور زندگی کی نئی ترغیبات کا مقابلہ کیا جاسکے۔

زندگی کے ان شعبوں اور ضرورتوں کے لئے جن کا اوپر تذکرہ ہوا، عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف شخصیتیں اور جماعتیں سامنے آئیں۔ جنہوں نے بغیر کسی دعوے اور بغیر امت سازی کی کوشش کے وقت کی ان ضرورتوں اور مطالبوں کو پورا کیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ انہوں نے کسی نئے مذہب اور کسی نئی نبوت کا علم بلند کیا اور نہ مسلمانوں میں کوئی تفریق اور انتشار پیدا کیا۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور عملی قوتوں کو کسی بے نتیجہ کام میں ضائع نہیں کیا۔ ان کا نفع ہر ضرر سے خالی، ان کی دعوت ہر خطرہ سے پاک اور ان کا کام ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ عالم اسلام نے اپنا کچھ کھوئے بغیر ان سے نفع حاصل کیا۔ اور مسلمان ان کی مخلصانہ خدمات کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

ایک ایسے نازک وقت میں عالم اسلام کے نازک ترین مقام ہندوستان میں جو ذہنی و سیاسی کشمکش کا خاص میدان بنا ہوا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب اپنی دعوت اور تحریک کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ وہ عالم اسلام کے حقیقی مسائل و مشکلات اور وقت کے اصلاحی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں، علم و قلم کی طاقت ایک ہی موضوع اور مسئلہ پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ مسئلہ کیا ہے۔؟

”وفات مسیح اور مسیح موعود کا دعویٰ“۔ اس مسئلہ سے جو کچھ وقت بچتا ہے۔ وہ حرمت جہاد اور حکومت وقت کی وفاداری اور اخلاص کی دعوت کے نذر ہو جاتا ہے۔ ربع صدی کی تصنیفی و علمی زندگی اور جدوجہد کا موضوع اور ان کی دلچسپیوں کا مرکز یہی مسئلہ اور اس کے سلسلہ میں مخالفین سے نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی ہے۔ اگر ان کی تصنیفات سے ان مضامین کو خارج کر دیا جائے جو حیات مسیح و نزول مسیح اور ان کے دعویٰ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل و مباحث سے متعلق ہیں۔ تو ان کے تصنیفی کارنامہ

کی مادی اہمیت اور وسوسہ ختم ہو جائے گی۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس عالم اسلام میں جو پہلے سے مذہبی اختلافات اور دینی نزاعات کا شکار تھا۔ اور جس میں اب کسی سنہ نزاع کے برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ نبوت کا غم بلند کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان نہ لائے۔ اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اور مسلمانوں کے درمیان ایک آہنی ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ جس کے ایک جانب ان کے متبعین کی ایک بھونٹی سی جماعت ہے جو چند ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف پورا عالم اسلام ہے۔ جو راکش سے چین تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جس میں عظیم ترین افراد، صالح ترین جماعتیں اور معتمد ترین ادارے ہیں۔ اس طرح انہوں نے عالم اسلام میں بلا ضرورت ایک ایسا انتشار اور ایک ایسی ہی تقسیم پیدا کر دی جس نے مسلمانوں کی مشکلات میں ایک نیا اضافہ اور عصر حاضر کے مسائل میں نئی پیچیدگی پیدا کر دی۔

مرزا غلام احمد صاحب نے درحقیقت اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا، جس کے لئے اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی معرفت اور مسلمانوں کی نسل مہدیان کی شکر گزار ہو۔ انہوں نے نہ تو کوئی عمومی دینی خدمت انجام دی جس کا نفع دنیا کے سارے مسلمانوں کو پہنچے۔ نہ وقت کے جدید مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کیا۔ نہ ان کی تحریک موجودہ انسانی تہذیب کے لئے جو سخت مشکلات اور موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہے۔ کوئی پیغام رکھتی ہے۔ نہ اس نے یورپ اور ہندوستان کے اندر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی جدوجہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر ہے۔ اور اس کا نتیجہ صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کر دی ہے۔ وہ اگر کسی چیز میں کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔ تو صرف اس میں کہ انہوں نے اپنے خاندان اور ورثہ کے لئے برائے خاندان۔ کہ اسلام کی طرح پیشوائی کی ایک سند اور ایک دینی ریاست پیدا کر دی ہے۔ جس کے افواج کو روحانی سیادت اور مادی عیش و عشرت حاصل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں وہ ذہنی انتشار نہ ہوتا۔ جس کا پنجاب، خاص میدان تھا۔ انگریزی حکومت کے اثر سے اسلامی معاشرہ میں اسلام کی بنیادیں متزلزل اور اسلامی ذہن ماؤف نہ ہو چکا ہوتا۔ اگر مسلمانوں کی نئی نسل دینی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی و تجدیدی شخصیتوں اور نیابت انبیاء اور عظمت انسانی کی حقیقی صداقت سے اتنی بے خبر نہ ہوتی اور آخر میں حکومت وقت کی پشت پناہی اور سرپرستی نہ ہوتی۔ تو یہ تحریک جسکی بنیاد زیادہ تر الہامات، خرابوں، تاویلات، اور بے کیف و بے مغز نکتہ آفرینوں پر ہے۔ اور جو عصر جدید کے لئے کوئی نیا اسلامی و روحانی پیغام اور مسائل حاضرہ کو حل کرنے کے لئے کوئی مجتہدانہ مقام

نہیں رکھتی۔ کبھی بھی اتنی مدت باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ جیسی کہ اس برس رخطاط موسائی اور اس پرانگندہ دماغ پرانگندہ دل نسل میں رہ سکی۔ اسلام کی صحیح تعلیمات اور دعوت سے انحراف اور ان غلصین و مجاہدین کی (جو ماضی قریب میں اس ملک میں پیدا ہوئے اور اسلام کے عروج اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اپنا سب کچھ متا کر چلے گئے) ناقدری کی منزا خدا نے یہ دی کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون کو مسلط کر دیا اور ایک شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو امت میں فساد کا مستقل بیج بر گیا ہے۔

دو سال ہوئے دمشق یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید کے موضوع پر ایک سلسلہ تقریر کے دوران میں راقم سطور نے تحریک باطنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

حضرات! میں جب باطنیت، انخوان الصفا اور ایران کی بہائی اور ہندوستان کی قادیانی تحریک کی تاریخ پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا نظر آتا ہے۔ کہ ان تحریکوں کے بانیوں نے اسلام اور بعثت محمدی کی تاریخ پڑھی تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص تنہا جزیرۃ العرب میں ایک دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نہ مال ہے، نہ اسلحہ۔ وہ ایک عقیدہ اور ایک دین کی دعوت دیتا ہے۔ اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ایک نئی امت، ایک نئی حکومت، ایک نئی تہذیب وجود میں آجاتی ہے۔ وہ تاریخ کا رخ تبدیل کر دیتا ہے۔ اور واقعات کا دھارا بدل دیتا ہے۔ ان کی بلند حوصلہ طبیعتوں نے ان سے کہا کہ اس کا نیا تجربہ کیوں نہ کیا جائے۔؟

انہوں نے دیکھا کہ وہ ذہانت، دماغی صلاحیت، تنظیمی لیاقت بھی رکھتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ ہیں پھر کیوں نہ تار و سنج اپنے آپ کو دہرائے گی۔ اور کس طرح انہیں دانتات کا ظہور نہ ہوگا۔ جو طبعی اسباب اور عمل کے ماتحت گزشتہ دور میں ہو چکے ہیں۔ ان کو امید تھی۔ کہ پھر اسی معجزہ کا ظہور ہوگا۔ جس کا تاریخ سنہ چھٹی صدی مسیحی میں مشاہدہ کیا۔ اس لئے کہ فطرت انسانی ناقابل تبدیل ہے۔ اور لوگوں میں ہمیشہ سے ہر دعوت قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

ان بلند حوصلہ انسانوں نے اس یکہ و تنہا ہستی کو تو دیکھا جو بغیر کسی سرمایہ اور بغیر کسی فوجی طاقت و حمایت کے ایک دینی دعوت لے کر کھڑی ہوئی لیکن اس کے پیچھے اس ربانی حمایت اور ارادہ الہی کو نہیں دیکھا جو اس کی کامیابی، غلبہ اور قیامت تک باقی رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور جس نے اعلان کر دیا تھا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْمَقْدُورِ
وَدُجِبَ الْمُعْتَرِ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ حَقَّهُ
وَلِتُكْفِرَ الْمَشْرِكُونَ۔ (الصفا: ۲۱)

وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت اور پیچھے
دین کیساتھ تاکہ ان سب دینوں پر غالب کرے
خواہ شرک کرنے والے کتنا ہی بڑا مانیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر ان کی کوششیں کامیاب اور بار آور ہوئیں اور انہوں نے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے ساتھی اور پیرو پیدا کر لئے۔ ان میں سے بعض نے (باطنیہ نے) عظیم الشان سلطنت (فاطمیہ) بھی قائم کر لی اور یہ سلطنت عرصہ تک پھیلی پھولی اور ایک زمانہ میں اس نے سوڈان سے مراکش تک قبضہ کر لیا، لیکن جب تک ان کی تنظیم ان کے مخفی انتظامات اور ان کی شعبدہ بازیاں باقی رہیں۔ یہ عروج بھی باقی رہا لیکن پھر وقت آیا کہ یہ سب عروج و افتخار اور یہ سب ترقی و اقبال ایک افسانہ بن کر رہ گیا۔ ان کے مذاہب ایک مختصر دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئے۔ جن کی زندگی پر کوئی اثر اور دنیا میں کوئی مقام نہیں اس کے بالمقام اسلام جس کو رسول اللہ ﷺ کو آئے۔ وہ آج بھی دنیا کی عظیم ترین روحانی طاقت ہے۔ اور آج اس کے ساتھ ایک عظیم الشان امت ہے۔ آج بھی وہ ایک تہذیب رکھتا ہے۔ اور بہت سی سلطنتوں اور قوموں کا مذہب ہے۔ نبوت محمدیؐ کا آفتاب آج بھی بلند اور روشن ہے۔ اور تاریخ کے کسی دور میں بھی وہ کہیں میں نہیں آیا۔

ہمیں فخر ہے کہ ہمیں عوام کو جو سہری توانائی

غذائیت سے بھر لو



مہیا کرنے کی سعادت حاصل ہے

آپ بھی

ہمیشہ یونیورسل فلور ملز کا تیار کردہ بہترین اور اعلیٰ استعمال کریں

مینجر۔ یونیورسل فلور ملز گلکھپار کالونی پشاور۔ فون ۲۰۴۰

مرزا غلام احمد

ایک شعر
پر
تضمینصاحبزادہ محمد حنیف اللہ صدیقی قاسمی
گھٹٹ خلع شیر لور میریں

سلام سنون کے بعد کمر عرض ہے کہ آپ کا رسالہ الحق چونکہ مرزائیت کے خلاف
جہاد اکبر کا فریضہ انجام دیر رہا ہے۔ اس لئے میں اپنی ایک نظم فارسی جو میں نے آنجنابی مرزا
صاحب کے ایک مشہور شعر کے بلائیت سیر ہر آئم صد حسین است در گریہ آئم
کے جواب میں لکھا ہے اور جسکو رئیس امر ہوی نے معیاری قرار دیا ہے، بھیج رہا ہوں
نظم یہ ہے :

گر چہ مدح حسین نعتہ آئم	سگ ابلیس از درش دآئم
کہ بعد کبر ہر خود گفتہ	کہ بلائے ٹیست سیر ہر آئم
اسے شبیست احپیں تری گفتی	کہ بلائے ٹیست فرحت عالم
یہ بلائے چوں توئی ز نسل یزید	قاتل شاہ دین و ہم عالم
در گریبان خود تو گر نگری	طوق لعنت بگردنت دآئم
خاست خود را تو گر نمی دانی	پرس از من کہ من ترا دآئم
چوں توئی طلب جارج بنجم	زان ترا کلب او ہی خوائم
چوں توئی کور ظاہر و باطن	چون صیائی حسین بنمائم
رونق عالم از جہاد حسین	دین باقی ازو درین عالم
عاصی بیترا ہمیں گوید	باد قربان بشاہ دین عالم
بار ایہا حنیف می گوید	خادم آل پاک گردآئم

زیڈال

یورپ والوں کا دعویٰ

غلط

ثابت کر دیا

زیڈال سے انگریز

ہفتوں ، مہینوں ، سالوں نہیں بلکہ گھنٹوں اور دنوں میں

گینج پیربال

گرتے بالوں کو فوراً روکتا ہے

زیڈال

۱۔ بیل روڈ

لاہور

اندلس

کے ایک متمول گھرانے کا کتب خانہ

احمد خان۔ ایم اے (عربی و لائبریری سائنس)
ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد

چوتھی صدی ہجری میں اندلس کے تقریباً ہر شہر میں علماء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ اور ان کے شخصی کتب خانے بھی تھے، مگر قرطبہ اس لحاظ سے تمام شہروں میں سبقت لے گیا تھا، کیونکہ یہاں کئی علمی گھرانے آباد تھے، جن کے اپنے کتب خانے برسوں سے قائم تھے۔ یہاں کے اہل علم و فضل اور متمول گھرانوں میں بنو فطیس کا مقام سب سے اونچا تھا۔ یہ خاندان قرطبہ کی سیاست میں بھی کافی دخل تھا یہاں تک کہ الحکم ثانی المستنصر (ابتداءً حکومت ۳۵۰ھ - ۳۶۶ھ) جس وقت سریر سلطنت پر بیٹھے تو ایک عام اجتماع میں اسی خاندان کے ایک فرد نے بادشاہ کے قائم مقام کی حیثیت سے تمام لوگوں سے بیعت لی۔ علم و فضل میں بھی اس خاندان کے لوگوں نے بہت نام پیدا کیا۔ ان میں عبدالرحمن بن محمد بن عیسیٰ بن فطیس کا نام سرفہرست ہے۔ مول و دولت کی بدولت اس خاندان نے قرطبہ میں اپنی رہائش کیلئے الگ ایک محلہ ”درب فطیس“ کے نام سے برسوں سے آباد کر رکھا تھا جبکہ ہر مکان اسی خاندان کی ملکیت تھا۔ اپنی ایک شاندار مسجد تھی، اس سے محلقہ ایک عظیم عمارت تھی جس میں علمی پیاس بجھانے کیلئے ایک عمدہ کتب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ عمارت خاص طور پر اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھی۔

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کتب خانے کی بنیاد کب رکھی گئی، تاہم اتنا واضح ہے کہ ابوالمطرت عبدالرحمن بن محمد کے عہد میں یہ کتب خانہ اپنی شانِ جلالت کے اعتبار سے قرطبہ کے تمام کتب خانوں سے بڑا تھا۔ اس کتب خانے کی تفصیل میں جانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے آخری مالک

جس کے عہد میں اسے چار چاند لگے ہیں، کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی جائیں۔ تاکہ ہم پر یہ بات پوری طرح منکشف ہو سکے کہ صاحب کتب زمانہ کس علوم و تربیت کا حامل تھا۔ کیونکہ اس سے اندازہ لگا کر کتب خانے کے بارے میں کافی حد تک صحیح رائے قائم کی جاسکے گی۔

صاحب کتب خانہ | عبدالرحمن بن محمد بن عیسیٰ بن فطیس بن اصبح بن فطیس قرطبہ میں ۳۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ صاحب ابوالمطرف کنیت رکھتے تھے۔ اس زمانے کے مروجہ تعلیم کے مطابق علم حدیث بہت جلد حاصل کر لیا۔ اس مقصد کیلئے اندلس کے مختلف شہروں میں کبار محدثین سے استفادہ کیا۔ وقت کے دستور کے مطابق جن حضرات سے حدیث سنی ان سے ساری روایات لکھ بھی لیں۔ علاوہ براب ابوالمطرف نے ان حضرات سے بھی کتاب علم کیا جو مشرقی ممالک سے قرطبہ میں وارد ہوئے تھے۔ بہت جلد ہی ان کے علم اور مہارت فی الحق کا شہرہ شاہ وقت تک پہنچا۔ وزراء ان سے مشورے لینے لگے۔ چنانچہ انہیں شرطہ اور محکمہ مظالم سپرد کیا گیا جسے وہ خوش اسلوبی سے چلاتے رہے۔ علم حدیث کے حصول میں اس قدر انہماک اور توجہ سے کام لیا کہ حقور سے ہی غصے میں بہت اونچے مقام پر فائز ہو گئے۔ یہاں تک کہ علماء ان سے استفادہ کرنے لگے۔ ان کی علمیت کے بلے میں ابن بشکوال رقمطراز ہیں :-

كان من جبهة المحدثين وكبار العلماء والمسندين حافظاً للحديث

وعلمه ، مشروباً الى فهمه واتقانه ، عارفاً باسماء رجاله ونقلته

يبصر المحدثين منهم والمجرحين ، له عناية كاملة بتقنييد السخن

والاحاديث المشهورة والحكايات المسندة ، جامعاً لها ، مجتهداً في

مما عدا وروايتها .

ابوالمطرف نہ صرف حدیث کے ماہر تھے بلکہ اس سے متعلق کئی اور علوم سے بھی بہرہ ور تھے کتاب الصلة ہی میں ہے :

وله مشاركة في سائر العلوم وتقدم في معرفة الآثار والمسير والاعبار

احاديث کی کتب نہ صرف پڑھیں۔ بلکہ کافی تک دو کے ساتھ جمع بھی کرتے رہے۔

حدیث کے پڑھانے کا کام انہوں نے اپنی مسجد میں کیا ہے۔ جہاں بہت سے لوگ استفادے کیلئے جمع ہو جاتے۔ انہیں یہ صاحب زبانی درس حدیث دیتے مگر وہ لوگ یہ سب کچھ احاطہ تحریر میں لے آتے۔ ابو علی الغسانی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالمطرف حدیث لکھوا رہے ہوتے اور لوگ بیٹھے لکھ رہے ہوتے۔ جتنے علم حدیث میں شہرت کا یہ عالم تھا کہ مکہ مکرمہ، بغداد اور قیردان کے علماء نے بعض مسائل کی افہام و تفہیم کی غرض سے ابوالمطرف سے خط و کتابت کی ہے۔ ان کے تخریج کی بدولت ہی حکومت کی طرف سے انہیں قرطبہ کے ایک گروہ کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اور ساتھ ہی جمعہ کی نماز اور خطبہ بھی ان کے سپرد ہوا۔ کہتے ہیں یہ دونوں عمل بیک قرطبہ میں کسی قاضی میں جمع نہیں ہو سکے۔ یہ شرف صرف انہی صاحب کو حاصل ہوا ہے کہ یہ خدمت ان کے ذمے ابو المنظر عبد اللہ بن ابی عامر کے قرطبہ میں گورنری کے ایام میں سپرد ہوئی تھی۔ ان تمام کاموں میں سب سے بڑھ کر جس سرکاری کام کو سرانجام دے رہے تھے وہ وزارت علیا میں شرطہ اور مظالم کے وائس تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

یہ صاحب طبیعت کے اعتباراً اگرچہ کافی سخت تھے۔ اور حکومت کے انتظامی امور میں کافی مدد و معاون ہو سکتے تھے مگر تھے علمی شخصیت اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد عرب سیاسی جھنجھوٹوں سے ہاتھ بھاڑ کر علمی دینی کاموں کے ہو رہے تھے اور صرف درس و تدریس اور جمعہ کا خطبہ دیتے رہے۔ بالآخر وہ صاحب علم و فضل، عظیم محدث اور محب کتب، قرطبہ میں بربروں کے

۷۰ ایضاً : عبد النبای : تاریخ قضاة الاندلس - ط القاهرة ، دار الکاتب المصری ،

۱۹۴۸ء - ص ۸۶

۷۱ عبد النبای (متوفی ۹۳ھ) نے لکھا ہے کہ جب ان صاحب کو قضا اور نماز کا کام سونپا گیا تو با اوصاف ہونے کے باوجود اس عمل پر قائم نہ رہ سکے اور انتقامت ، استتلال کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ اس لئے کہ جس شخص کی جگہ انہیں مقرر کیا گیا تھا۔ وہ (ابن ذکوان) ان سے کہیں زیادہ اچھے تھے۔ اسی لئے لوگوں کو کافی اندر ہوا۔ چنانچہ نو ماہ کے بعد معزول کر دئے گئے۔ دیکھئے عبد النبای : تاریخ

قضاة الاندلس - ص ۸۶

داخلے کے وقت نصف ذی القعدہ ۸۰۲ھ میں انتقال کر گئے، انہیں اپنی مسجد کے قریب خانہ زانی قبرستان میں اسی روز سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ ان کے بیٹے ابو عبد اللہ محمد نے پڑھائی تھی۔ انہوں نے علوم قرآن و حدیث اور تاریخ میں کافی تصانیف چھوڑی ہیں جن کی فہرست تراجم کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔^۹

کتاب خانہ جس عہد میں عبدالرحمن ابن فطیس نے انکھیں کھولیں۔ اس وقت قرطبہ کی گلی میں کتاب خانے قائم ہو چکے تھے۔ لوگ خانہ زانی و جابہت، مشہور اور علمی فضیلت کے اظہار کی خاطر بھی کتاب خانے قائم کرتے تھے۔ ان کا کتاب خانہ اگرچہ اباد و اجداد سے چلا آ رہا تھا مگر وہ اس قدر توجہ کا مرکز نہ بن سکا جس قدر کہ ان صاحب علم و دولت کی زندگی میں اسے دھیان دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ یہ صاحب علمی اعتبار سے مروجہ اقدار کے مطابق علم سے پوری طرح بہرہ ور تھے۔ ان کی شہرت تقریباً تمام مسلم ممالک میں پھیل چکی تھی۔ پھر اللہ کا فضل بھی تھا کافی مال و دولت کے مالک تھے۔ طبیعت سے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ عام اصول و دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے دوران انہوں نے احادیث کی بہت سی کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کر لی تھیں۔ علاوہ بریں تمام عمر حدیث لکھ کر اس سے علمی خدمت سرانجام دیتے رہے۔^{۱۰}

اللہ نے انہیں عمدہ خط و دلیعت کیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ کتاب کو باقاعدہ صحیح ترین شکل میں لکھنے کے عادی تھے۔ اپنے ہاں کتابیں پڑھانے اور ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ کرنے میں اکثر بڑھ پڑھ کر مستعدی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ حدیث کی تعلیم زبانی دیتے۔ مگر طلباء و علماء کو حکم دیتے کہ لکھ لیا کریں۔ ابن بشکوال نے اس امر کا ذکر یوں کیا ہے:

وكان يملئ الحديث من حفظه في مسجد و مستعمل بين يديه

علوم ما ليعلمه كبار المحدثين بالمشرق و الناس يكتبون عنه۔^{۱۱}

یہ متفقہ امر ہے کہ یہ صاحب مشرق یعنی شمالی افریقہ اور جزیرہ مغرب میں نہیں آئے۔ مگر ان کا طریق تدریس بالکل مشرقیوں جیسا تھا۔ انہی کے مطابق لوگ قلم و دوات کے ساتھ مسجد

۹۔ ابن بشکوال: کتاب الصلۃ۔ ج ۱ ص ۲۹۹-۳۰۰

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۳۰۰

۱۱۔ ایضاً: ص ۲۹۸

میں حاضر ہوتے اور شیخ الحدیث کے تمام لیکچر لکھ لیا کرتے تھے۔

استاذ بڑے اہم اور علمی کام کی سرانجام دہی میں جو چیز ابن فطیس کو امداد بہم پہنچا رہی تھی وہ ان کا خاندانی کتب خانہ تھا جس میں اس کے اپنے ہاتھ کی نقل کردہ اور دیگر مشاہیر کی لکھی ہوئی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ تھا۔

کتب خانہ کی عمارت | در سب بنی فطیس کا یہ محلہ قرطبہ کے اہم محلوں میں شمار ہوتا تھا جس میں یہ علمی و سیاسی خاندان برسوں سے رہائش پذیر تھا۔ یہاں انہوں نے محلے کی تمام ضروریات مہیا کر رکھی تھیں جن میں مساجد حمام اور دیگر عوامی ضروریات کی چیزیں میسر تھیں۔ ان میں اس خاندان کی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے قریب ہی ایک مسجد تھی۔ اسی مسجد سے متصل ان کے کتب خانے کی عمارت تھی، جو خاص طور پر اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھی۔ اس کتب خانے کی عمارت کی تعمیر میں یہ بات مد نظر رکھی گئی تھی کہ ایک خاص جگہ سے کتب خانے کی ساری کتابیں بیک وقت نظر آسکیں۔ چونکہ یہ عمارت بہت بڑی تھی اس لئے اس امر کا نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس دشواری کے باوجود ان حضرات کے ذوق جلال اور کتابوں سے محبت نے اس عمارت کو نہ صرف مناسب اور عمدہ بنایا بلکہ کافی جاذب نظر بھی تھی۔ پتہ نہیں لگتی نقطہ نظر سے یا کسی اور وجہ سے ابوالمطرف نے اس عمارت کیلئے سبز رنگ پسند کیا تھا۔

چنانچہ انہوں نے کتب خانے کی پوری عمارت اندر سے اسی رنگ میں رنگ دی تھی۔ یہاں تک کہ دروازے، کھڑکیاں اور تختیں بھی سبز کر دی گئی تھیں۔ کتب خانے میں قارئین کیلئے دکھا ہوا فرنیچر، فرش، پردے، اگرے اور تکیے وغیرہ سبھی اس رنگ میں تھے۔ ابو الحسن علی بن عبداللہ النباضی نے ابوالمطرف کے کتب خانے کی عمارت کی یوں تفصیل دی ہے:

وكان بداره مجلس عجيب المنعة، حسن الالة، ملبس كله بالحضرة
جدرانہ والبوابہ وسقفہ ودریشہ دستورہ وبنارقہ۔ وكل ذلك
متشاكل الصفات۔ وقد ملأه من فائز العلم وداوین الكتب التي ينظر
فيها ويخرج منها۔ وبهذا المجلس كانت آتية وخنوته۔ ۱۲۷

یوں تو یہ تفصیل اس قدر اچھی اور عمدہ تر معلوم نہ ہوتی ہوگی۔ مگر اتنی تفصیل کا ان ادوار میں تراجم کی کتابوں میں وارد ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ یہ امر اپنی اہمیت اور قدر و منزلت کے اعتبار سے اس مقام

پر تھا کہ ابوالمطرف کے سوانح نگاروں نے اس کتب خانے کی عمارت کو خاص طور پر بیان کیا، جبکہ بڑے بڑے جید علماء کی زندگیوں کے حالات صرف چند سطروں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس عمارت کی اہمیت اور توصیف میں جو کلمات کہے گئے ہیں اس قدر الفاظ تو بڑے بڑے سٹا ہی کتب خانوں کی عمارتوں کو بھی میسر نہیں آسکے۔ یہ سب اس کتب خانے کی بڑائی کی عمدہ سند ہے۔

سٹاک | اس دور میں طباعت کتب اور ان کا پھیلاؤ اس قدر آسان نہ تھا۔ جس قدر آج ہے کتابوں کے اصلی نسخوں کا حصول، پھر ان کی نقلوں کی تیاری میں بہت سی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کاغذ کا حصول بھی ناممکن کی حد تک تھا۔ اور اگر کہیں ملتا تو اس کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس دور کے حالات پڑھتے وقت ان مشکلات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ابوالمطرف، جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا ہے، ساری عمر کتابیں پڑھنے، لکھنے اور دوسروں کی کتابیں نقل کرنے میں گے رہے۔ ان کا خط بہت عمدہ تھا۔ اور جو کچھ لکھتے تھے، اس کو باقاعدہ ضبط کیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی نقل کردہ کتابیں صحت اور درستی کے اعتبار سے بہت عمدہ سمجھی جاتی تھیں۔

ان کے کتب خانے میں کتابیں صرف حدیث پر ہی نہ تھیں، بلکہ ہر طرح کے عام طور پر ہوتا تھا کہ اگر کوئی صاحب محدث ہوتے تو ان کے ہاں صرف حدیث کی کتابیں، اگر کوئی عالم ادیب ہوتا تو صرف شعر و ادب سے متعلق کتابیں اپنے کتب خانے میں رکھتا۔ مگر اس کے برعکس ابوالمطرف ہر ساری عمر حدیث کی خدمت کرتا رہا، اسے پڑھتا پڑھاتا رہا، اسی علم میں نظر عمیق پیدا کرنے کی خاطر اس نے اس وقت کے مروجہ تقریباً تمام علوم کی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ یہ کتابیں صرف ان علوم کی بنیادی کتابوں پر ہی مشتمل نہ تھیں بلکہ اپنے فن اور مقدار کے اعتبار سے ابوالمطرف کا کتب خانہ اس وقت کے کتب خانوں سے گونے سبقت لے گیا تھا۔ چنانچہ اس کی سوانح حیات لکھنے والے بھی تہذرات متفقہ طور پر اس بابت کے قائل ہیں کہ:

وہ مشارکۃ فی سائر العلوم و جمع من الکتاب فی الفروع العلمیۃ
یجمعہ احد من اہل عصرہ بالاسدلس۔ ۱۵۷

۱۵۷ ابن بشکوال: کتاب الصلۃ ج ۱ ص ۲۹۸۔ ۱۵۸ ابن زہون السعری: کتاب الایماج

المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب ط بصرہ ۱۳۵۱ھ - ص ۱۵۰ - ابن بشکوال: کتاب الصلۃ

ان کی وہ عظیم عمارت ایسی ایسی عمدہ کتابوں سے بھری ہوئی تھی، جیسا کہ النباہی نے اوپر بتایا ہے۔
قد ملاحظہ فرمائیے۔

اس دور میں نادور اور مشاہیر کی تحریر کردہ کتابیں جس کتب خانے میں پائی جاتی اس کیلئے ان کا وجود قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ایسی کتابوں کے حصول میں ہر دم کو متان و سرگرداں رہتے تھے۔ چنانچہ ابوالمطرب کو جب کہیں اپنے مقرر کردہ آدمیوں کی معرفت یا کسی اور ذریعے سے اس امر کا علم ہوتا کہ فلاں عالم کے پاس کسی کتاب کا نادور نسخہ ہے یا بہت عمدہ تحریر کردہ ہے تو وہ پہلے تو اس نسخے کو خریدنے کی سر تیز کوشش کرتے۔ کئی گنا قیمت بڑھانا تو ایک عام بات تھی۔ اس شخص کو منہ مانگے دام دینے پر بھی رضامند ہو جایا کرتے تھے۔ اور اگر کسی طور بھی وہ صاحب اس کتاب کو بچنے پر رضامند نہ ہوتے تو اس کو کسی اور واسطے سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر پھر بھی کامیاب نہ ہوتے تو کم از کم اس کتاب کی نقل حاصل کرنے یا دوسرے نسخوں سے اس کا مقابلہ کرنے کی اجازت تو ضرور حاصل کر لیتے تھے۔ کتب خانے میں نئی نئی اور نادور الوجود کتابوں کے اضافے کیلئے کئی وراق ملازم رکھے ہوتے تھے۔ جو دن رات کام کر کے کتابوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔
علمہ اگرچہ یہ کتب خانہ برس برس سے اس خاندان کے مختلف لوگوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اور انہوں نے اسے بنانے میں اپنی ہمتیں صرف کیں ہیں۔ مگر خود ابوالمطرب نے ساری عمر اس کیلئے کام کیا ہے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ علماء کو حدیث لکھواتے تھے، تو یقیناً اس کے نسخے اپنے ہاں بھی محفوظ کرتے تھے۔ مگر ان سے بڑھ کر یہ کہ یہ صاحب خود بھی کتب خانے میں بیٹھ کر کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے چھ وراق باقاعدہ ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں حسبِ مراتب معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ تاکہ وہ اطمینان سے یکسر ہو کر کام کر سکیں اور عجلت کی وجہ سے جو غلط اور اسقام رہ جاتے ہیں ان کا خدشہ نہ رہے۔

کسی کتب خانے کی عظمت کا اندازہ لگانے کیلئے اس کے علمے کی طرف بھی دیکھا جاتا ہے۔ اگر عمدہ قسم کے لوگ، عالم و فاضل اور کافی پڑھے لکھے ہوں تو اس کتب خانے کے شاگ اور طوریت کی دلالت ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابوالمطرب خود اسی کتب خانے میں کام کرتے تھے جن کا علم و فضل

اد پر بیان ہو چکا ہے۔ ان کے ہاں کام کرنے والوں میں سے سب کا علم تو نہیں ہو سکا، البتہ ایک صاحب کاپتہ چلتا ہے۔ یہ صاحب ابو عبد اللہ محمد بن عیسیٰ بن محمد بن علی بن ابو ثور الحضرمی (۳۱۷ھ - ۳۹۶ھ) تھے۔ یہ صاحب دراصل تھے تو بسط کے باشندے مگر قرطبہ میں اگر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہاں آنے سے قبل انہوں نے مروجہ علوم میں درک حاصل کر لیا تھا۔ اسی طرح بڑے بڑے جید علماء سے کسب فیض بھی کر چکے تھے۔ ان کے بارے میں ابن بشکوال رقمطراز ہیں :-

دكانته له عناية كثيرة لسماع العلم وتقييده وروايته وكان رجلاً صالحاً. وكان حسن الخط، جيد الصنيط. وكان ينسخ للمقاضي أبي المطرف بن فطيس، كتبه و يقيده مقالاً. ۱۹

یہ صاحب سب سے پہلے پہل قرطبہ میں آئے تو در ب بنی فطیس ہی میں سکونت اختیار کی اسی محلہ کی مسجد میں ابو المطرف نے انہیں امام مقرر کر دیا۔ اور ان سے حدیث وغیرہ بھی سنیں۔ اسی وجہ سے انہیں یہاں کے لوگوں میں ایک مقام حاصل ہو گیا۔ ابن فطیس اپنی کتابوں میں جہاں کہیں حدیث الحضرمی کہتے ہیں تو اس سے مراد ان کے یہ امام ہوتے ہیں۔ ۱۹

ان کا خط بہت عمدہ تھا۔ پوری صحت کے ساتھ کتابیں نقل کرتے۔ ابو المطرف کی مختلف مواقع پر کی گئی تقاریر بھی صنبط تحریر میں لایا کرتے تھے۔ اس کتب خانے میں یہ صاحب کتابوں کی فہرست بنانے اور خاص و اہم کتابوں کی نقلیں تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ ۱۹

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو المطرف نے اپنے عملے میں کتنے عمدہ قسم کے فضلا جمع کر رکھے تھے۔ علاوہ بریں انہوں نے اپنے عملے میں کام کی تقسیم پورے موچے سمجھے منصوبے کے تحت اور عملے کی لیاقت و استعداد کے مطابق کر رکھی تھی۔

کتب خانے کی خدمات | چوتھی صدی ہجری میں یہ تصویر کرنا کہ کسی شخص کا کتب خانہ عوام کیلئے آج کی طرح کافی ضرورتیں پوری کر رہا ہوگا۔ ایسا خیال تو بالکل غیر مناسب ہے۔ تاہم جو کام اس وقت کے وقف کتب خانے کرتے تھے۔ تقریباً اس کے برابر خدمات یہ کتب خانہ بھی سرانجام دے رہا تھا۔ چونکہ اس خاندان کے بھی حضرات اس محلے میں مقیم تھے اس لئے اجتماعی طور پر انہوں نے خوانی ضروریات

کی جگہیں قائم کر رکھی تھیں، جن میں مسجد، درس و تدریس کیلئے مدرسہ اور یہ کتب خانہ ان میں شامل تھے۔ چنانچہ وہ سب اس کتب خانے سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ باہر سے آنے والے علماء اور طلباء علم بھی اس سے برابر کام میں لاتے تھے۔

کتابوں کے صنایع کے پیش نظر انہیں ہر ایک کو مستعار نہ دینے کے بارے میں ابوالمطرف کے پورے ابو سلیمان نہیں بتاتے ہیں کہ :

ان القاصد جدها كانت لا يعير كتابا من اصول البتة -

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاص اور اہم کتابیں جو اصول کا درجہ رکھتی تھیں۔ انہیں تو وہ مستعار کسی کو بھی نہیں دیتے تھے۔ البتہ دوسری قسم کی کتابیں خاص خاص آدمیوں کو دے دیتے تھے۔ ایسی کتابیں جن کے حصول میں ان صاحب نے بہت تکلیف اٹھائی ہیں۔ یا جنہیں حاصل کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ ان کے حصول میں کامیابی کے بعد ان کے صنایع ہو جانے کے خدشہ کے تحت کسی کو مستعار دینے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اسی طرح اصول کی کتابیں بھی حتی الامکان مستعار نہیں دیتے تھے۔ مگر ایسی کتابوں کے بارے میں بھی کوئی صاحب لبند ہوئے اور انہیں مستعار لینے پر مجبور کرتے تو ابوالمطرف اس کتاب کو کتب خانے کے عملے سے بہت محفوظ سے وقت میں دوسرا نسخہ نقل کروا دیتے۔ یہی نہیں بلکہ اصل کے ساتھ باقاعدہ مقابلہ بھی کروا دیتے۔

یہ سب صرف اس لئے کرتے تھے تاکہ اصل نسخہ محفوظ رہے۔ کیونکہ انہیں اس امر کا تلخ تجربہ تھا کہ مستعار لینے والا کتاب کو شاذ و نادر ہی واپس کرتا ہے۔ یہ بات تو عام ہے کہ کتابیں مستعار لینے والے اکثر بھول جاتے ہیں یا جان بوجہ کر اسے نہیں لوٹاتے۔ اس بات سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ کتابیں عوام کو مستعار دیتے تو بھتے مگر اہم و خاص کتابوں کے اصل نسخے دیتے کی بجائے نقل کروا دیتے تھے۔ اگر وہ صاحب مستعار لی ہوئی کتاب واپس کر دیتے تو جہاں درہ وہ منقول نسخہ اسے ہی عطا کر دیتے تھے۔ ان کے حسن سلوک سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ کتب خانوں میں آج کل قارئین کی سہولت کیلئے فوٹو گرافی اور دیگر نقول دینے کیلئے جو خدمات سر انجام دی جاتی ہیں وہ اس وقت بھی ابوالمطرف اپنے کتب خانے میں قارئین حضرات کیلئے ہیما کئے ہوئے تھے۔

ابن بشکوال : کتاب الصلۃ - ج ۱۰ ص ۲۹۹

ابن ایضاً : فکر و نظر (ماہنامہ) جنوری ۱۹۷۳ء - ص ۱۵۵

کتاب خانے کا انجام | عربوں البلاد قرطبہ باربا ابرٹا اور لہسا۔ کئی علمی خزینے برباد ہوئے رہے اور پھر جلتے رہے۔ مگر بعض دفعہ ایسے حالات بھی پیش آئے کہ جو کتاب خانے برباد ہوئے ان جیسے کتاب خانے اس کے بعد کے ادوار میں نہ بن سکے۔ سیاسی زبردہم اور ملکی بے ثباتی نے اکثر کتاب خانے ختم کئے ہیں۔ ایسے حالات ہی میں ابوالمطرف کا کتاب خانہ بھی ختم ہو گیا۔

بربریوں نے جب اندلس میں طوائف الملوک کو ختم کرنے کیلئے اقدام کئے تو ان حالات میں عوام کی بے چینی میں خاصا اضافہ ہوا کیونکہ علمی و ثقافتی زندگی تقریباً محض ہو گئی۔ چیزوں کی قیمتیں بے سنگم طریقے سے قائم ہونے لگیں۔ لوگ گھروں میں بوس رہنے لگے اور معاش کے ذرائع مسدود ہو گئے تو بنو فطیس کے حالات بھی کافی متاثر ہوئے۔ رتن حیات کو قائم رکھنے کی خاطر ابوالمطرف کی وفات (۴۰۲ھ) کے بعد یہ علمی خاندان اپنے اباؤ اجداد کے اس عظیم و بیش بہا ورثے کو بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ جس جگہ ابوالمطرف درس و تدریس اور کتاب نگاہی کا کام کیا کرتا تھا۔ اسی مسجد میں یہ لاشانی ذخیرہ ٹاکر ڈھیر کر دیا گیا۔ اور پھر قسط وار نیلام ہوتا رہا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ابوالمطرف کی جمع کردہ کتابیں صحت اور ضبط تحریر کے اعتبار سے بہت اونچی تھیں۔ انہوں نے کئی کتابوں کے اصول جمع کر رکھے تھے، اسی اہمیت کی بدولت انہیں خریدنے کیلئے قرطبہ کا بہت بڑا حصہ ٹوٹ پڑا ہو گا۔ اور انہیں باعقول ہاتھ لیا ہو گا۔ مگر اس بے چینی اور بے ثباتی کے عالم میں یہ ذخیرہ ایک سال تک اس مسجد میں بکوتا رہا۔ اور تقریباً قرطبہ کے سبھی باشندے اس کی خریداری کیلئے آتے رہے۔ ابوالمطرف کے پوتے ابوسیمان نے اپنے چچے اور خاندان کے کئی دیگر افراد سے سنا کہ :

ان اهل قرطبة اجتمعوا لبيع كتب جده هذا سنة عام كامل في

مسجده في الفسحة في العلاء، وانه اجتمع فيها من الثمن اربعون

الف دينار۔ قاسمیتہ۔ ۲۳

اس طرح ان خاندان کو اسی وقت کے چالیس ہزار مینونے کے سکے (دینار قاسمیتہ) حاصل ہوئے۔ ابن خربون کے انداز سے کے مطابق اس کے عہد میں یہ رقم اٹھ لاکھ دیناروں کے برابر تھی ۲۳

۲۳ ابن بشکوال : کتاب الصلۃ ج ۱ ص ۲۹۹

۲۳ ابن خربون : کتاب الديباج المذهب ص ۱۵۰

جناب نور محمد غفاری ایم اے

قسط
۲

تفسیر اور علم تفسیر

الغرض ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر اور تادیل دونوں ایسے علم ہیں جو قرآنی معارف کی شرح و ایضاح کے لئے ضروری ہے۔ اور دونوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ تفسیر کا لفظ سارے قرآن کی تشریح پر بولا جاسکتا ہے۔ اور تادیل صرف متشابہات کی قبیل سے متعلق آیات کی وضاحت پر یا بعض آیات کے باطنی مفہوم کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر کا نام "تادیل" رکھا ہے۔ مثلاً ابن قتیبہ متوفی ۴۰۵ھ کی "تادیل شکل القرآن" اور ابو منصور رائد متوفی ۳۳۳ھ کی "تادیل القرآن" وغیرہ۔ تو اس کا جواب نہایت سہل ہے کہ "تادیل" کا لفظ غالباً تیسری چوتھی صدی ہجری تک تشریح قرآن کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ کیونکہ اس وقت تک عربی زبان کا غلبہ رہا۔ اور ویسے ہی صحیح تابعین کا زمانہ نہایت قریب ہی گذرا تھا۔ لہذا تقریباً تمام امت مسلمہ قرآنی الفاظ اور عبارت کا مفہوم باسانی سمجھ لیتی تھی۔ لہذا مفسرین حضرات صرف مشکل القرآن اور غریب الفاظ یا متشابہات کی تفسیر پر زور دیا کرتے ہیں۔ اور یہ وہ آیات اور الفاظ تھے جن میں ظاہری مفہوم کی بجائے باطنی مفہوم بتانا مقصود تھا۔ لہذا مفسرین حضرات نے اپنی تشریحات کو "تادیل" یا "تادیلات" کا نام دیا۔ (واللہ اعلم بالفتاویٰ)

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت ثابت کرنے کے لئے جو دلائل دیتے ہائیں گے، انہیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ عقلی دلائل

۲۔ نقلی دلائل

۱۔ نقلی دلائل | انہیں ہم آگے مذکورہ ذیل حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔
 و۔ تفسیر کی ضرورت اور تاکید قرآن حکیم کی روشنی میں۔
 سبب۔ تفسیر کی اہمیت و فضیلت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں
 ج۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔
 ح۔ تعامل علماء امت کی روشنی میں۔

۲۔ قرآن مجید کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی تشریح و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہارگان: قرآن نبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
 بَعَثَهُمْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ
 يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
 وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
 (آل عمران: ۱۶۴)
 بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بہت
 بڑا احسان کیا۔ کہ ان میں انہی میں سے ایک
 رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات سنانا ہے
 ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب
 اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان فرامین میں ایک "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" اب تعلیم نام صرت الفاظ کے پڑھ دینے کا
 نہیں۔ بلکہ تشریح اور تفسیر کا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَنَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ
 فَلْيُتْلَ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِ
 (ملہ: ۴۴)
 ہم نے (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ
 پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے
 اس بات کی وضاحت کریں جو ان کی طرف نازل کی
 گئی ہے۔

یہ "تین کلام" تشریح و توضیح کا ہی دوسرا نام ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا۔
 إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
 لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ
 (نساء: ۱۵۵)
 ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری
 تاکہ آپ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی میں
 فیصلہ کریں۔

حاصل کلام، قرآن مجید نے بتایا کہ کتاب اللہ کی تفسیر ضروری ہے۔
 ۳۔ حدیث شریفہ کی روشنی میں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی تفسیر

اپنے قول و فعل دونوں سے فرما کر دکھائی اور امت کو تفسیر کا حکم بھی دیا۔ اور فضیلت بنا کر ترغیب بھی دلائی۔ مثلاً

۱۔ سورہ ”حدید“ اور اسکی تفسیر سیکھو۔ (بحوالہ الاتقان نوع ۷۸)

۲۔ حضرت ضحاکؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تو کہ تعالیٰ: ”يُؤْتِي الْحِكْمَةَ“ سے قرآن کا عطا کرنا مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ”قرآن کا عطا کرنا سے قرآن کی تفسیر مراد ہے۔ کیونکہ پڑھنے کو تو نیک و بد سبھی پڑھتے ہیں۔“
۳۔ بیہقی وغیرہ نے سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ”قرآن مجید کی تعریب (تفسیر) کر دو۔ اور اس کے غریب اور نفاذ میں الفاظ کی تلاش میں سرگرم رہو۔“

۴۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا فرمائی :
اللَّهُمَّ فَقِّهْ فِي الدِّينِ وَعَلِّمْهُ اسے اللہ! اسے دین کی فقاہت بخش اور
التَّوْبِيلِ۔ تاویل کا علم عطا فرما۔

تفسیر گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت کی پیروی کرنا ہے۔

ج۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین :۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مقالات پر باقاعدہ حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ مثلاً مدینہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ راشدہ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کلام اللہ مجید کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو تفسیر کرنے کا حکم اور ترغیب دی مثلاً :

۱۔ حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ”جو شخص قرآن شریف پڑھتا ہے۔ اور اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں کر سکتا اس کی مثال اس اعرابی کی ہے۔ جو شعر کو بے سوچے سمجھے اور غیر موزوں پڑھتا ہے۔ (مقابل القرآن لابن جریر اللہدی)

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : ”بیشک مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں قرآن کی کسی ایک آیت کی تعریب (تفسیر و توضیح) کروں۔ بہ نسبت اس بات کے کہ میں ایک آیت حفظ کر لوں۔“ (عن الانباری)

اگر کاوش سے کام لیا جائے تو اور بہت اقوال ان حضراتؒ کے مل سکتے ہیں۔

در تعامل علماء امت : صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد پھر ہر دور میں تفسیر کا عمل برابر جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ علماء نے اپنے عمل اور تحریر و تالیف سے یہ بات ثابت کر دی کہ تفسیر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے بغیر قرآن کا فہم ممکن نہیں۔ اسی لئے علماء نے تفسیر کرنے کو واجب علی الکفایہ کا درجہ دیا ہے۔

علماء نے بڑی بڑی تفاسیر تصنیف کی ہیں۔ مثلاً امام رازیؒ کی ”مفاتیح الغیب“، تفسیر طبری، تفسیر مدارق ذات البہم وغیرہ ان میں سے تفسیر صدائق ذات البہم کے پانچ سو (۵۰۰) اجزاء ہیں۔

۲۔ عقلی دلائل | اور حضرت امام ابن تیمیہؒ کی دلیل : ”اس بات کی تشریح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ایسی زبان سے مخاطب کیا ہے جس کو وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے پروردگار عالم نے ہر ایک رسولؐ کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ اور اپنی کتاب کو بھی اپنی قوموں کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ پھر یہی بات کہ اب تفسیر کی حاجت کیوں رہی؟ تو اس کا جواب ایک قاعدہ کی قرار دلو کہ بعد دیا جائے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص کتاب تصنیف کرتا ہے، وہ صرف خود ہی سمجھنے کے لئے تصنیف کرتا ہے۔ اور اس کی کوئی تشریح نہیں کرتا۔ لیکن اس کتاب کی شرح کی حاجت عین وجہ سے پڑتی ہے۔

اول :۔ ان میں سے پہلی بات مصنف کی فصاحت کا کمال ہے کہ وہ علمی قوت کی وجہ سے وجیز لفظوں میں دقیق معنی کو جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات مصنف کی مراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا ایسی صورت میں شرح سے ان مخفی معنوں کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے جو اپنی تصانیف کی شرح خود ہی لکھی ہیں، وہ بہ نسبت ان شرح کے جو دوسرے لوگوں نے لکھی ہیں، بہت زیادہ مراد پر دلالت کرنے والی ہیں۔

دوم :۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنف اپنی کتاب میں چند مسائل کی وضاحت کے لئے کچھ مزید باتیں اور شرطیں اس خیال سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ امور اور شروط واضح چیزیں ہیں یا ان کو درج نہیں کرتا کہ ان چیزوں کا تعلق کسی دوسرے علم سے ہوتا ہے۔ لہذا ایسی حالتوں میں شرح کرنے والے کو امر مخدوف اور اس کے مراتب کے بیان کی حاجت پیش آتی ہے۔

سوم :۔ تیسری بات یہ ہے کہ لفظ میں کئی معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ مجاز، اشتراک اور دلالت التزام کی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ان صورتوں میں شارح پر لازم ہے کہ وہ مصنف کی غرض کو بیان کرے اور اسے دوسرے معنوں پر ترجیح دے۔

ان تین باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بشری تصانیف میں وہ باتیں بھی واقع ہو جاتی ہیں جن سے کوئی بشر غالی نہیں۔ مثلاً تسامح، تکرار اور اسی نوع کے دیگر نقائص۔ لہذا شارح کو ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ مصنف کی ان لغزشوں کا بھی اظہار کر دے۔

اب جب یہ بات ٹھیک قرار پاگئی، تو اب ہم کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کا نزول محض عربی زبان میں ہوا اور عربی بھی کس دور کی؟ انصاف العرب کے زمانے کی زبان! پھر ان لوگوں کو بھی قرآن کے ظاہر امور اور احکام ہی کا علم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے اندر دینی مفہوم کی باریکیاں ان پر اسی وقت منکشف ہوتی تھیں جب وہ بحث و تشخیص سے کام لیتے یا غور و خوض کرتے تھے۔ اور اکثر باتوں کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً جس وقت خداوند اقدس کا یہ ارشاد گرامی نازل ہوا: **وَلَسَ يَلْبَسُوا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ**۔ نازل ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا۔ (یعنی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا) اس وقت بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ کے لفظ ”ظلم“ کی تفسیر ”شُرک“ کے ساتھ فرمائی اور اس پر دوسری آیت: **”اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ“** کو بطور دلیل کے پیش کیا۔ یا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ”حَسْبَا بِالْيَسِيْرِ“ کی بابت سوال کیا تھا کہ وہ کیا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ”عرض“ (یعنی اعمال کا حرف پیش کرنا) ہے۔ اور جیسے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قصہ ”الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ“ کے متعلق ہوا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری باتیں ہیں جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ایک کر کے بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا۔

اور ہم لوگ بھی ان باتوں کے محتاج ہیں جن کے محتاج حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ علاوہ ازیں ہمیں احکام ظواہر میں سے بھی ایسے امور کے علم کی حاجت کی احتیاج ان حضرات رضی اللہ عنہم کو ہرگز نہ تھی اور ہماری اس احتیاج کا سبب ہمارا بغیر سیکھے ہوئے احکام لغت کے مدارک (فہم) سے قاصر ہونا ہے۔ لہذا ہم کو تمام لوگوں سے بڑھ کر تفسیر کی ضرورت اور حاجت ہے۔

اور یہ بات بھی محتاج بیان نہیں کہ قرآن شریف کے بعض حصہ کی تفسیر صرف و جیز الفاظ کی شرح کرنے اور یہ بات ان کے معنی کو منکشف کر دینے سے ہوجاتی ہے۔ اور بعض مقامات کی تفسیر حید احتمالات میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے ہوتی ہے۔ (بحوالہ الاتقان، نوع ۷۸)

۲۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام اشخاص یکساں فہم و فراست، تفکر و تدبیر اور صلاحیت و قابلیت کے نہیں ہوتے، کوئی کچھ فہم ہے تو کوئی زود فہم اور کوئی ذکی ہے۔ تو کوئی باطل غبی۔

اس وجہ سے کسی بات یا کلام کو سمجھنے میں ہر ایک یکساں نہیں ہوتا۔ پھر عام لوگوں کا کلام تو الگ رہا جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا ہو جس کی جامعیت، بسط، ہمہ گیری اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں جس میں بیشمار مطالب، فصاحت و بلاغت، اوصاف کلام اور معنی و بدیع کا ایک چمن کھلا ہوا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے کلام کی تشریح و تفسیر ایک ضروری چیز ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

۳۔ پھر قرآن ایک پہلو سے اصول و کلیات کی کتاب ہے۔ جس میں جزئیات نگاری سے کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ ہی اس میں فروعی باتوں کو کھپانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان اصولی و کلیات کی تشریح اور جزئیات و تفصیلات کی تبتین و تفسیر ضروری ہو جاتی ہے۔ پھر قوانین و احکام کی تفصیلی صورت، حدود و قیود اور ان کا اطلاق واضح طور پر متعین ہونا چاہیے۔ اور اس ضرورت کو تفسیر پورا کرتی ہے۔

الغرض، مندرجہ بالا عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کس قدر ضروری ہے۔ اس کے ذریعے ہی ہمیں اس کتاب مقدس کا فہم حاصل ہوگا جس میں ہماری نبوی و اخروی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔



ہماری ★ ڈی۔ ڈی۔ ٹی
مصنوعات ★ ہائیڈوکلورک الیڈ
★ پیرا ڈائی کلورو بنزین

ملک کی مصنوعات کی سرپرستی کیجئے

منجانب :- ڈی۔ ڈی۔ ٹی فیکٹری

جدید زبانوں

محترم جناب منظر عباسی - (مری)

(۲)

عربی لفظ

لفظ ایک زبان سے بڑھ کر کے دوسری زبان میں جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ اور اسکی صورت کس طرح مسخ کی جاتی ہے؟ اس کا اندازہ عربی کے لفظ "امیر" سے کرنا چاہیے۔

امیر | امیر عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں صاحب امر یعنی حاکم، انچارج، نگراں وغیرہ۔ پھر صاحب امر یعنی حاکم مال و دولت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ اس نسبت سے اردو میں امیر مالدار، جنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی اردو والوں نے لفظ کے مفہوم میں تبدیلی باوجود یہ کہ اسکی صورت مسخ نہیں کی۔ البتہ اہل یورپ نے اس کا علیحدہ لگا دیا ہے۔

مسلمان یورپ میں سپین کے راستے گئے تھے۔ اور سپین فتح کرنے کیلئے مسلمانوں نے ہر روم کو عبور کیا تھا۔ گویا مسلمانوں کی بحری فوج نے سپین فتح کیا۔ اور اسی فوج کے مجاہدوں نے سپین میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان مجاہدوں کا سپہ سالار بحری فوج کا کمانڈر "امیر البحر" کہلاتا تھا۔ اس نے "امیر البحر" کی اصطلاح اپنائی اور اس سے "بحر" حذف کر دیا۔ "بحر" کا لفظ حذف ہونے کے بعد انہیں صرف "میر" کا لفظ اپنانا چاہئے تھا۔ لیکن عربی زبان سے واقف نہ ہوئے۔ انہوں نے "بحر" کے شروع میں واقع "ال" امیر کے ساتھ جوڑ کر "امیرال" بنالیا اور اس کی سی زبان میں بحری فوج کے نگران کو AMIRAL (امیرال) کہا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے عربوں نے یہ لفظ اپنا، تو انہوں نے شروع شروع میں صرف "ال" فرانس کو نقل پر اکتفا کیا۔ AMIRAL (امیرال) ہی بولتے اور کہتے رہے۔ چنانچہ پرانی انگریزی میں یہ لفظ ملتا ہے۔ وہیں اسکی صورت مسخ کر کے اسے ADMIRAL (ایڈمرال) بنا دیا اور آج کا بحری فوج کے

نگران یا صاحب امر کے لئے ADMIRAL (ایڈمیرال) مستعمل ہے۔

عزیز فرمایا آپ نے کہ فرانس والوں نے لفظ کی صورت اس طرح بدلی کہ "بحر" کے شروع میں کلمہ تعریف یعنی "ال" واضح تھا اسے اپنی ناسمجھی کے باعث "امیر" کے آخر میں جوڑ دیا۔ اور "امیر" کو "امیرال" بنا ڈالا۔ اور فرانس والوں سے انگلینڈ والوں نے جب یہ کلمہ مستعار لیا۔ تو اس میں "ایڈ" کا اضافہ کر کے ایڈمیرال (ADMIRAL) بنا دیا۔

معنوی اعتبار سے بھی تعریف کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ "امیرال" یا "ایڈمیرال" ہر قسم کے نگران، سردار، یا صاحب امر کے لئے نہیں بلکہ صرف بحری فوج کے نگران اعلیٰ کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ حالانکہ جب لفظ بحر حذف کر دیا تھا۔ تو اس لفظ کی عمومیت باقی رہنی چاہئے تھی۔ اور نہ صرف فوج بلکہ ہر شعبہ کے نگران کو "امیر" یا "ایڈمیرال" کہنا چاہئے تھا۔

جبل الطارق اسپین، امیر البحر، اور مسلمانوں کی بحری فوج کے ذکر سے ایک اور لفظ یاد آیا۔ جسکی اہل یورپ نے صورت سن کر کے ایک مثال اور نمونہ فراہم کیا ہے۔ یہ ہے "جبل الطارق" پرانے اندلس اور موجودہ اسپین کے جنوبی ساحل پر ایک شہر آباد ہے، جس کا نام GIBRALTAR (جبرالٹر) ہے۔ یہ عربی لفظ "جبل" اور "طارق" کا مرکب ہے۔ یعنی طارق کا پہاڑ۔ یہ وہ پہاڑی مقام ہے جہاں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں مسلمانوں کی بحری فوج نے سرزمین اندلس میں پہلی چھاؤنی بسائی تھی۔

اہل یورپ نے "جبل الطارق" کی صورت سن کر اسے GIBRALTAR (جبرالٹر) بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ لفظ عربی کے جبل الطارق سے لیا ہے، لیکن کسی قاعدے قانون کی نشاندہی نہیں کر سکتے جس کے مطابق "جبل" کو "جبرال" اور "طارق" کو "ٹر" بنا لیا ہے۔ غالباً "امیر البحر" کی طرح "جبل الطارق" میں "ال" سے "ال" جبل کے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ اور جبل کے "ل" کو "ر" سے بدل ڈالا ہے۔ اس طرح جبل "جبرال" بن گیا۔ باقی رہا "طارق" سو اس کا "ق" حذف کر کے "طار" باقی رکھا۔ جو تلفظ میں TAR یعنی تار اور پھر "ٹر" بن گیا۔

"ل" اور "ر" (یا اور R) کا آپس میں ایک دوسرے سے بدل جانے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خود عربی میں "سیر" اور "سیل" دو لفظ ہیں جن میں "ر" اور "ل" کا فرق ہے۔ اور معنی کم و بیش ایک ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں "سیر" کا اسم فاعل "سیلانی" مستعمل ہے۔ اگر "ر" اور "ل" آپس میں نہ بدلتے تو یا "سیر" کا اسم فاعل "سیرانی" ہوتا یا سیلانی کا مادہ "سیل" ہوتا۔

حشیش | حشیش عربی میں جھنگ کو کہتے ہیں۔ جھنگ نشہ آور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ